Journal of Positive School Psychology
2023, Vol. 7, No. 6, 1558-1569 http://journalppw.com

Contemporary Discourse On Political Islamic Vision And Neo-Colonialism (In The Perspective Of Urdu Nazm)

Muhammad Rauf[1] , Muhammad Farhan Ur Rehman (Corresponding Author)[2] , Muhammad Khakan Ajmal[3] , Adnan Ahmad[4], Muhammad Riaz Ahmad Riaz[5] , Beenish Mushtaq[6]

[1]Ph.D. Assistant Professor of Urdu Govt. Graduate College Samanabad, Faisalabad, Pakistan muhammadrauf 992@ gmail.com
[2]Ph.D Scholar Islamic Studies, MY University Islamabad & Managing Editor "Scholar Insight Journal" Jhelum, Pakistan. farhanrehmanmuhammad@gmail.com
[3]Assistant Professor of English, Govt. College University Faisalabad, Pakistan
[4]Ph.D. Assistant Professor of Urdu ,University of Jhang, Jhang, Pakistan.
[5]Ph.D. Department of Urdu (Visiting) Govt. College University Faisalabad.
[6]Ph.D. Lecturer in Urdu, University of Narowal, Pakistan

Published: 20 June, 2023

Abstract
Neo-Colonialism is a political situation and postmodernism a theoretical position working side by side in the present global phenomena. Both of which are linked with colonialism and modernity, commonly considered to be the basic causes of Islamist's decline especially in the perspective of their religious identity. After gaining the neo-colonized liberties, the thinking patterns and social fabric of such conditioned societies could not be decolonized properly and neo-colonialism (post world-war 2nd) versioned the situation particularly after the decline of Russian Marxism. Later on, events like Youm-e-Kippur War (1973) and 9/11 caused a heated discourse on Islamic thoughts and Neo-Colonialism. This historical phenomenon has also been there textualized in the cotemporary Urdu poetry. As in the research paradigm termed as ''literal sociology'' we discuss a social fabric in the light of literary text, hence in this article we are going to repeat such practice focusing on the religio-political discourse among Islamists and the West in the special perspective of Urdu poetry.

Keywords: Neo-Colonialism, Postmodernism, Islamic thoughts, Russian Marxism, 9/11, Youm-e-Kippur War, Urdu poetry

Introduction

بیسویں صدی کا آخری اور اکیسویں صدی کا حالیہ ربع اوّل یک قطبی دنیا میں نیو ورلڈ آرڈر کا عبرت آموز بلیو پرنٹ بنا کر سب کے سامنے لا چکا ہے۔تاریخِ عالم کی بد ترین کشید گی کے اس دورانیے کی لوح پر اگر معرکۂ یوم کپور(۱۹۷۳ء)جیسا استعماریت شکن واقعہ تسطیر ہو رہا تھا تو تمت میں کچھ دفاعی مزاحمت کاروں کے ہاتھوں ۱۱ ۹ جیسی عبرت آموز سر گرمی کی تلفیظ کاری جاری تھی۔ مذکورہ دونوں واقعات اپنے اصولی جواز(Legitimacy))سے قطع نظر استعماریت شکنی کے حوالے سے بہت بڑا دھچکا(Shipwreck) ثابت ہوئے ہیں۔ادھر بیانیوں کی جدلیات کا غالب تاثر یہ رہا کہ ایسے وقوعات ''تہذیب پر حملہ''اور ''کھلی دہشت گردی''ہیں جن کے پیچھے کار فرما قوتیں کو قابلِ مزمت جاننا چاہیے۔یاللعجب!

مزکورہ واقعات میں سے اوّل الذکر کے بعض اور مؤخر الذکر کے بیشتر اسرار آج تک پردۂ اخفا میں ہیں جس کی بنا پر ادبی بیانیے میں یہاں مذکور بالخصوص ۱۱ ۹ کا وقوعہ ابہام کا

ایسے قولِ محال کی سی ہے جس نے دہشت گردی کو استعاراتے ہوئے (Metaphorization of Terrorism) مسلم تاریخ کے ہیروز کو ولن اور اور ولن کا ساغدارانہ کردار ادا کرنے والوں کو ہیروز بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس واقعے پر بننے والے کلامیے میں جہاد باسیف جیسی مقدس اور سنجیدہ ترین سرگرمی کو دہشت و وحشت کی کاروائی بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ بلاشبہ یہ خلطِ معاملت تاریخِ عالم کے ایک سیاہ باب کی ترجمان ہے۔

اجمالاً دیکھا جائے تو یہ دونوں واقعات حد درجہ تاریخی اور مسلم اقوام کے لیے نہایت نتیجہ خیز تھے۔ یقیناً ایسے واقعات معاصر ادبی فعالیتوں کے لیے کچھ اچھا علمیاتی خام مال ثابت نہیں ہوتے مگر ان واقعات کی تاریخی ماہیت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مخصوص تخلیقی فاصلہ میسر آنے پر انھیں جلد یا بدیر بہر حال متنی سازی کے عمل کا حصہ بننا ہے۔ تاہم ان واقعات کی سنگینی سے معاصر ادبی کینوس پر ابھی سے گہرا ارتعاش محسوس کیا جانے لگا ہے جسے محض لمحاتی یا ہنگامی اُبال کہہ کر نظر انداز کیے جانا بھی انتقادی حسّاسیت کو اپنے ہاتھ سے دینے کے مترادف ہو گا۔ ایسی ہنگامی تخلیقات کی اہمیت یوں بھی ہے کہ ہمارے لمحۂ موجود اور مستقبل قریب کا قاری انھی متون کی پڑھت سے مذکورہ واقعات کی تفہیم کرنے اور اس پر اپنے فکری ردّ عمل دینے کا پابند ہو گا۔ یوں بھی ایک فنکار شدید نوعیت کے جذبات و افکار کی متنی تشکیل کے لیے لازمی طور پر کوئی مخصوص زمانی دورانیہ گزارنے کا پابند نہیں ہوتا بلکہ لمحاتی ادب کی تخلیق پر بھی یکساں دسترس رکھتا ہے۔ یہ بات البتہ محلِ نظر رہنی چاہیے کہ ایسا تخلیقی بیانیہ حالات و واقعات کا حقیقی ترجمان نہیں ہوتا کیوں کہ ان وقوعات کی ترجمان زبان اوّل تو بذاتِ خود ان کا مافیہ ادل بدل کرتی ہے اور پھر معاصر مقتدرہ کی آئیڈیالوجی سے بھی لازمی طور پر ان میں بہت کچھ بدلاؤ آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر ضیاالحسن (پ:۱۹۶۴ء) اور ناصر عباس نیّر (پ:۱۹۶۵ء) اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ:

استعارہ (Metaphor of Confusion) بن کر سامنے آیا ہے۔ بادی النظر میں اس کے اس کے تین چار تناظرات تو سامنے کے ہیں۔ ایک تو یہی کہ استعماریت کی حالیہ ثقافتی یلغار کو اپنی نظریاتی اساس کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے کچھ خود ساختہ اسلام پسندوں نے یہ مدافعاتی اقدام کیا ہے اور اس غیر اجتہادی کاوش کو عام مسلمان اسلامیوں کو دی گئی آخری فتح کی بشارت کا پیش خیمہ سمجھ کر خوش ہیں۔ دوسرا یہ کہ اشتراکی روس کے خاتمے پر نو استعماریت کا جو نیا عالمی نظام وجود میں آیا تھا اسے ایشیا میں ہونے والی طاقت کی نئی صف بندی سے شدید تحفظات در پیش تھے۔ چونکہ ایسے میں اسلام اور اشتراکیت کے ممکنہ نئے گٹھ جوڑ کی صورت میں پھر سے کسی سرد جنگ کی شروعات کا خدشہ تھا، لہٰذا کچھ اشتعال انگیز اقدامات کر کے خود ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ مشتعل فریق کی طرف سے ردّ عمل آئے اور جواباً ایسے ممکنہ اتحادی امکان کو ختم کرنے کے اقدامات کیے جا سکیں۔ اور یہ بھی کہ جس طرح سرد جنگ میں مسلمان مجاہدین کی اعانت سے امریکہ نے روسی انہدام کی پالیسی اپنائی اب ایسی ہی کچھ معکوسی کارروائی دہرائی گئی ہو۔ یہ بات بھی محلِ نظر آتی ہے کہ امریکی معاشرہ ایک الگ طرزِ حیات کا داعیہ رکھتا ہے۔ سماجی انصاف کے دعوے بجا مگر بیرونی دنیا کی بڑی تعداد جو یہاں آبسی ہے آج تک غیر (Other) سمجھی جاتی ہے؛ ہو سکتا ہے کسی غیریت کے متاثرہ فریق نے ایسا اقدام کیا ہو۔ بعض باخبر حلقے تو یہاں تک دعویٰ رکھتے ہیں کہ امریکہ نے شیعہ اثر رسوخ کو روکنے کے لیے عرب ممالک سے شہ پا کر القاعدہ اور داعش جیسی عسکریت پسند جماعتوں کو خود پروان چڑھایا تھا تاکہ دہشت گردی کا خوف پھیلا کر ان علاقوں میں اپنی پسند کی حکومتیں بنائی جا سکیں، وعلیٰ ہذا القیاس۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ مختلف بیانیوں کا یہ کولاژ تو محلِ نظر رہے ہی، دیکھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ بہت بالا دست مگر فی الوقت متاثرہ فریق نے اہمیت کس بیانیے کو دی اور اس کے ردعمل میں مزاحمت کے اہداف کس نوعیت کے تھے۔ اس وقوعے کی نوعیت ایک

”کسی تاریخی واقعے کا جو
متن تیار ہوتا ہے، اس
پر اس مقتدرہ کی
آئیڈیالوجی کا لازمی اثر
ہوتا ہے، جس کی نگرانی
اور منشا سے یہ متن تیار
ہوتا ہے۔“[۱]

مذکورہ واقعات کے تناظر میں دیکھیں تو پہلے وقوعے میں عرب اسرائیل اس چوتھی جنگ کا تذکرہ ہے جو مصر اور شام جیسے عرب ممالک نے اپنی سرزمین کو صیہونی استبداد سے بچانے کی غرض سے لڑی اور سرخروئی حاصل کی۔ یہ معرکہ ۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء سے ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء تک جاری رہا، جسے یہ نام انھی دنوں منائے جانے والے یہودی تہوار ”یوم، کپور“ کی زمانی مناسبت سے دیا گیا تھا۔ یہاں مؤخرالذکر وقوعہ یعنی ۱۱ ۹ البتہ زیادہ محلِ نظر ہے جس میں امریکی دفاعی ادارے پینٹاگون اور عالمی تجارتی ادارے کو نشانہ بنایا گیا تھا۔اتنی بات تو عمومی مسلمات میں سے تھی کہ یہ دہشت ناک اقدام استعماری بندوبست کے کسی مخالف گروہ کی طرف سے کیا گیا تھا۔اس عسکری کارروائی کو صدر ٹونی بلئیر (پ:۱۹۵۳ء) نے ’تہذیب پر حملہ‘ قرار دیا جس کا بین السطور مطلب یہ تھا کہ اب عیسائیت کے تمام حواریوں کو بہم مل کر ’مسلم دہشت گردی‘ کا جواب دینا چاہیے۔کوئی بھی بڑی تہذیب بڑے مذہب کی اساس پر ہی قائم ہوتی ہے۔عالمی ٹکراؤ کے اس منظر نامے میں ”تہذیبوں کا تصادم“ عملی طور پر ہنٹنگٹن (۲۰۰۸ء۔۱۹۲۷ء) کی ۱۹۹۶ء بلکہ ۹۳ء میں کی گئی پیشین گوئی کو حرف بہ حرف ثابت کر رہی تھی۔اسی مقدمے کا ایک کلیدی نکتہ ”Religion is a central defining characteristic of civilization“[۲] کی صورت بیان کیا گیا ہے۔یوں ڈیڑھ درجن کے قریب ان ہائی جیکروں کی متوازی اسلام ازم (Parallel Islamism)[۳] کی ترجمان جہادی کاوش کو اسلامی عقیدے کی بے رحمی پر محمول کر کے پروپیگنڈا کیا گیا کہ اسلام ایک دہشت گرد مذہب ہے۔اسی سے جڑی یہ مفروضاتی ضمنی بھی خوب مشتہر رہی کہ اسلام پسندوں کو مسندِ اقتدار ملنے پر نظامِ ہستی کو کیسے کیسے بھیانک نتائج دیکھنے پڑ سکتے ہیں۔ عرب ممالک اور اسرائیل کی مذکورہ جنگی صورتِ حال میں بھی اسی بیانیے کی تشہیر سے بارِ دگر اس صیہونی ریاست کی سرپرستی جاری رکھی گئی تھی۔ ہنٹنگٹن پیغمبر نہیں تھا مگر ۱۱ ۹ کے واقعے سے اپنی پیش بینی کی سند لے کر واقعی اہلِ کتاب ٹھہرا اور اس کا یہ صحیفہ ہاتھوں ہاتھ بکنے لگا۔وہ کہیں یہ بحث نہیں اٹھاتا کہ برطانیہ اور روس میں ’گریٹ گیم‘ اور بعد ازاں امریکہ اور روس میں سرد جنگ کے بجائے دوطرفہ معرکہ کیوں نہ ہوا اور قومیتی تصادم یکایک تہذیبی محاربوں میں کیوں بدل گئے؟ یہ دراصل تہذیبی تصادم کے نام پر مینڈے اور بھیڑیے کے درمیان شکار کی ایک سادہ کارروائی تھی۔ تصادم برابر کے حریفوں میں ہوتا ہے اور یہاں کمزور حریف کو مذکورہ بھیڑیے کی طرح اس کا حسب نسب یاد دلا کر برابر کی چوٹ ثابت کیا جا رہا تھا۔ یہاں ہنٹنگٹن کی پیشین گوئی کے بجائے تقدیر کے قاضی کا وہ فتویٰ کارفرما تھا جس نے ’جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات‘ بتا رکھی ہے۔

اس حملے کا ملبہ عرب نژاد مسلمانوں کی قیادت میں میں کارفرما ایک جماعت القاعدہ پر ڈالتے ہوئے تنظیم کے مرکزی کمانڈر اسامہ بن لادن (۲۰۱۱ء۔۱۹۵۷ء) کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔اطلاعات کے مطابق یوں تو اس کی عسکری سرگرمیوں کا مرکز افغانستان کا علاقہ تھا مگر خفیہ طور پر (مبینہ) اسے پاکستان میں بھی کوئی پناہ گاہ میسر رہی۔ظاہر ہے کہ اس کارروائی کے بعد نہ صرف افغانستان پر گولہ بارود کی برساتیں ہوئیں بلکہ پاکستان کو بھی فرنٹ لائن سٹیٹ بنا کر اس کی جغرافیائی حمیت کی تخفیف کی گئی۔الغرض اس حملے کو جواز بنا کر جواباً ” غارت گری، آدم کشی “ کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو کسی نہ

یہاں تک نظم کا ایک عمومی بیانیہ مکمل ہو جاتا ہے۔ شاعر آزادیٔ فکر کے ازلی و ابدی مرکز یعنی حرمِ کعبہ کے متولیوں سے شاکی ہے کہ انھوں نے عہدِ نَو کے ابرہہ سے مفاہمت اختیار کر کے خلقِ خدا کو بے سہارا کر دیا ہے۔ دراصل یہ وہی شکوہ ہے جو اسلامی مقتدرہ کے روبہ زوال ہونے پر مختلف مراحل سے گزر کر ایسے مایوسی کے منطقوں آپہنچا ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں قومیت پرستی کو فروغ ملا تو اہلِ عرب نے اسے عملی جامہ پہناتے ہوئے خلافتِ اسلامیہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ملتِ اسلامیہ کے مرکزیت مائل نظام کو نظرانداز کرتے ہوئے کئی مزید مسلم ریاستوں نے خود مختاری اختیار کر لی اور خلافتی مرکز یعنی ترکیہ کو 'یورپ کا مردِ بیمار' کہا جانے لگا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سلطنتِ اسلامیہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی جن میں سے ہر ٹکڑے کا معاشی اور دفاعی نظام اپنے استعماری آزاد کنندگان کے ہاتھ میں تھا۔

دراصل نئی استعماری صورتِ حال ماقبل کے نو آبادی نظام سے کہیں زیادہ گمبھیرتا کا باعث بنتی ہے۔ ایک طرف نو آباد کار حکمرانوں کو اپنے اصلی ملک میں جواب دہی کا احساس رہتا تھا اور دوسری طرف ان کے مقامی گماشتے بھی محبِ وطن لوگوں کی بغاوتوں کے پیشِ نظر محتاط رویہ رکھنے پر مجبور تھے مگر نو استعماری بندوبست میں سیاسی حرکیات کی یہ سادگی باقی نہ رہی۔ نئی استعماریت کی انتظامی اساس یہ تھی کہ اپنے زیرِ انتظام علاقوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر کے اس طرح کی آزادی دی جائے کہ یہ ممالک اپنی معاشی ضرورتوں اور حفاظتی انتظامات کے لیے سابقہ آقاؤں کے دستِ نگر رہیں۔ جب اشتراکی محاذ کے پسپا ہونے پر نو استعماری مقتدرہ کو یک قطبی حیثیت حاصل ہو گئی تو اس پر ''تاریخ کے خاتمے'' (The End of History and the Last Man) کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ اعلامیہ اس بات کا ثبوت تھا کہ دنیا میں سرمایہ داری نظام کی متعارفہ لبرل جمہوریت اپنی تصادم گریز نوعیت کے سبب کسی شکل میں آج تک جاری ہے۔ ادھر استعماری طاقتوں کی اس کھلی جارحیت پر سید مبارک شاہ (۲۰۱۵ء-۱۹۶۱ء) کی ایک نظم ''ابابیلیں مقید ہیں'' ملاحظہ فرمائیں:

''خداوندا! ترے گھر
کا وہ دشمن ابرہہ
نامی جسے تیری
ابابیلوں کے لشکر نے
بہت پہلے خس و
خاشاک کر ڈالا تھا،
زندہ ہے وہ زندہ
ہے (عہد نو کا ابرہہ)
اور اپنے لشکروں پر ناز
کرتا ہے وہ اب
ساری ابابیلوں سے
اونچا ہے بہت پرواز
کرتا
ہے۔۔۔ خداوندا!
وہ اب اتنا قوی ہے
کہ خدائی میں اسی کی
بادشاہی ہے ترے
گھر کو گرانے کی اسے
اب کیا ضرورت ہے
کہ تیرے گھر کے والی
بھی اسی کا نام لیتے
ہیں اسی کا ذکر کرتے
ہیں۔''(۴)

تھے،اسے سجدہ نہ
کرتے
تھے خداوندا! یہ
اجڑے لوگ اب بھی
آسماں کی وسعتوں ان
پرندوں کو صدا دیتے
ہیں جوان کے بلانے
پر نہیں آتے کہ شاید
اب ابابیلیں بھی اسی
سے رزق لیتی ہیں
اسی کا ذکر کرتی ہیں
(۵)''

اس طرح اساطیری رموز و علائم کا جمالیاتی اظہار یہ تاریخ کی روشن حقیقتوں سے شروع ہو کر مابعد الطبعیاتی مقتدرہ سے انسلاکی تعطل کی خبر دیتے ہوئے ختم ہو جاتا ہے۔۔واقعہ یہ ہے کہ خدا کی اس کائنات میں بھی علت او معلول کا ایک لطیف بندھن بالعموم قائم رہتا ہے۔ہماری لوک دانش میں 'ہر کمالے راز والے' کی کہاوت بہت غلط طور پر سمجھی گئی ہے۔قوموں کے عروج و زوال کی وجوہات ہوتی ہیں اور اسلامی فکر و عمل کی اساس میں اس نکتے پر جو توجہ دی جاتی رہی ہے اسے بطورِ خاص نمایاں کرنے کی شاید ضرورت ہی نہیں۔مذکورہ نظم میں بھی اسی اصول کے تحت مابعدالطبعیاتی نظمِ کار کی ایک فعالیت کو 'اجڑے ہوئے لوگوں کی صدا' اور ابابیلوں کے درمیان روبہ عمل آنا تھا جو بوجہ نہیں آسکی۔شاعر کا مرغِ تخیل اس کی تشکیک آمیز علت یہ تلاشتا ہے کہ ابابیلوں نے غالباً دانے دنکے کے لالچ میں آکر ابرہہ سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔اب وہ اسی خمارِ گندم میں پڑ کر الوہی امور کے ضمن میں اپنے فطری فریضے کی بجا آوری کرنا بھول گئی ہیں۔ یہ مفروضہ درست ہو بھی سکتا ہے مگر اس ایک 'گمان کا ممکن' اسے یہ انسانیت کے فکری ارتقا کی آخری منزل ہے۔دراصل یہ اعلامیہ اسلام کے اسی فکری نظام کو چرکہ پہنچانے کا داعیہ رکھتا تھا جسے 'دانشِ مغربیاں' ابھی اپنا مضبوط حریف خیال کرتی تھی۔مشرق وسطیٰ کے اسلامی مفکر برناڈ لیوس(۲۰۱۸ء۔۱۹۱۶ء) نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور اپنی کتاب ''اسلامی طیش کی جڑیں (The Roots of Muslim Rage) میں اس موقف کی ترجمانی کی کہ مسلمان معاشرے کے لیے مغرب کا نظریاتی،سیاسی اور معاشی ماڈل نہایت ناموزوں ہے۔دراصل یہی وہ نظریاتی نقطۂ نظر تھا جسے سیموئیل پی ہنٹنگٹن(۲۰۰۸ء۔۱۹۲۷ء) نے مغربی سرمایہ داریت سے ہم آہنگ کرکے ''تہذیبوں کا تصادم'' (Clash of Civilizations) کی صورت پیش کیا اور نیم بسمل امتِ مسلمہ کو آخری چرکہ لگانے کے لیے فکری زمین ہموار کر دی جس کا عملی مظاہرہ نہتے لوگوں پر جوہری بموں،حیاتیاتی ہتھیاروں کے بے دریغ استعمال سے ظاہر ہے۔

مبارک شاہ کی مذکورہ نظم میں تخریبی قویٰ کے حامل آج کے اسی نئے ابرہہ کی ظلم و زیادتی سے بچنے کے لیے الوہی اعانت طلب کی جا رہی ہے جس نے تہذیبی تصادم کے نام پر اسلامی دنیا کے خلاف 'صلیبی جنگ' شروع کر رکھی ہے۔گذشتہ سے پیوستہ نظمیہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مگر جب اس کے
سینے میں گھروندوں کو
گرانے کی جبلت جاگ
اٹھی تو وہ قریے اس
کے لشکر نے اجاڑے
ہیں جہاں کے بسنے
والے اس کے منکر
تھے تجھے معبود کہتے

مظلوماں پر لبیک کہتے ہوئے ان کی اعانت کو پہنچنا چاہیے تھا۔ دراصل نظم کا بیانیہ اسی مشاریت کو علمیاتی دھارے کے مرکز میں رکھنا چاہتا ہے۔ یہاں یہ امر مسلّمے کے طور پر ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ جنگ محبت، سچائی اور تخلیق کی قاتل ہے جبکہ یہی چیزیں حقیقی اسلام کا ورثہ ہیں۔ تصادم جنگلوں اور بھیڑوں کی باقیات ہے اور اسلام تو اپنی تمدنی اساس ہی اصولِ اخوت پر استوار کرتا ہے۔ ایسے میں مذکورہ دین کو دہشت سے جوڑنے جیسا محال مفروضہ گھڑنے کے لیے کوئی ہنٹنگٹن کا سا زرخیز ذہن ہی چاہیے؟ حیرت مگر یہ ہے کہ کاذب حقیقت (Hyper Reality) پر مشتمل ایسا بیانیہ گھڑا تو گیا ہی تھا، اس کی میڈیائی پزیرائی عالم گیر رہی اور اسی بیانیے کی اوٹ میں آتش و آہن سے خونِ مسلم کی ارزانی کا ناٹک بھی خوب رہا۔ کبھی یہی خونِ مسلم 'صرفِ تعمیرِ جہاں' ہوا کرتا تھا مگر آج اسے رزقِ خاک ہوتے دیکھ کر کوئی۔۔۔ عملی انداز کی۔۔۔ آہ بھرنے کو بھی تیار نہیں۔ ایسے میں ن م راشد(۱۹۷۵ء-۱۹۱۰ء) کی نظم ''شہر کی صبح'' اپنا ٹائم بیریئر توڑ کر صدا کے اس قحط کی کچھ بھرپائی کو آتی ہے:

''مجھے فجر آئی ہے شہر
میں مگر شہر آج
خموش ہے کوئی شہر
ہے کسی ریگ زار
سے جیسے اپنا وصال
ہو نہ صدائے سگ
ہے نہ پائے دُزد کی
چاپ
ہے۔۔۔اے تمام
لوگو! کہ میں جنھیں
کبھی جانتا تھا کہاں ہو
تم؟ تمھیں رات

دیکھنے کی فرصت نہیں دیتا کہ ابابیل اگر 'بلانے پر نہیں آتے' تو اس کی ایک وجہ اجڑے لوگوں کی 'صدا' میں مستور کوئی جوہری خرابی بھی تو ہو سکتی ہے جس کی بنا پر اسے قابلِ مسموع نہ سمجھا گیا ہو۔ اس مفروضے کی امکانی صوابت کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ غیبی امداد کے لیے دعا گو امتِ مسلمہ خداوند کو 'معبود کہتی' تو ہے، اپنے عمل سے اس کی تصدیق کا دعویٰ نہیں کرتی۔ علامہ اقبال بھی یہ نکتہ اپنی شاعری میں موزوں کرتے رہے ہیں کہ ' فطرت افراد سے تو اغماض برت سکتی ہے، ملت کے گناہوں کو معاف نہیں کرتی'۔ کبھی کبھی 'شامتِ اعمال' ہی 'صورتِ نادر' اختیار کر کے خود شکنی کا سامان کرنے لگتی ہے۔ مذکورہ نظم کا یہ مستوری متن اذیت کا باب سہی مگر لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے؟ جب ہم نظریاتی تصورِ ملت پر مصر رہنے کے باوجود اس کے اقتضائی عوامل کو نظر انداز کریں گے تو فطرت کا مذکورہ اصول حرکت سے باز نہیں آئے گا، اور 'نزلہ بر عضوِ ضعیف' تو ایک قدیمی قاعدہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ' 'جنگ یومِ کپور" سے پیدا شدہ صورتِ حال ہو یا ۱۱ ۹ جیسے واقعے کا مابعدی ردّ عمل،، دونوں میں استعماری قوتوں کا مقصودِ حقیقی مسلمانانِ عالم کو اس جذبۂ حریت کے تخریبی امکانات سے خوف زدہ کرنے سے عبارت لگتا ہے جس کا حکم ایک مخصوص حالت میں 'جہاد فی سبیل اللہ' کی صورت نازل کیا گیا تھا؛ حکم موجود ہے اور مستلزم حالات کی گمبھیرتا واضح! انتہائی تشویش ناک ستم ظریفی مگر یہ ہے کہ اسلام اور مادیت پرستی کی جدلیت پر متشکل ہونے والے اس علمی کلامیے میں اسلامیانِ عالم کو جن عقائد و افکار کی حرمت کے پیشِ نظر معتوب ٹھہرایا جا رہا ہے وہ تو ایک عرصے سے ان کی حیاتِ اجتماعی میں موجود ہی نہیں۔ یاللعجب!!

مبارک شاہ کی مذکورہ نظم ہی کے حوالے سے بات کی جائے تو معلام ہو گا کہ یہاں مستعمل ابابیل کی تلمیح پھیل کر اسلامی اخوت پر یقین رکھنے والے ان جملہ مسلمانوں کی مشاریت (Signification) بھی کرنے لگتی ہے جنھیں اس صلائے

سونگھ گئی ہے کیا؟ یا
ہو دور قیدِ غنیم
میں ؟جو نہیں ہیں
قیدِ غنیم میں وہ پکار
دیں۔'' (۶)

راشد کے اس آوازے کی بازگشت وحید احمد (پ:۱۹۵۹ء) کے کان پڑتی ہے تو وہ بھی 'آوازِ دوست' کی کرب ناکی محسوس کرتے ہوئے اس کی شانتی کا کچھ سامان کرنے لگتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم ''سلام نیٹشے '' میں فلسفۂ تخریب موزوں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے تصادم خیر وشر، کفر واسلام اور اس قبیل کے دیگر فکری عوامل سے انگیخت نہیں پاتے بلکہ ان کی حرکیات دوسری ہیں۔ کبھی ان حرکیات پر علامہ اقبال نے اپنی نظم ''قوت اور دین'' میں اپنا موقف تلفیظ کیا تھا۔ شکتی دیوی میں ہر سکت موجود ہے، اڑچن ہے تو فقط یہ کہ اپنی دوئی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ دوئیت کا شعور (Awareness of Otherness) اس کی مگر نہاد میں نہیں۔ یہ کام ایک تیسری قوت (جسے وحید احمد ' رچرڈ' کا نام دیتا ہے) اس کے لیے سرانجام دیتی ہے، جسے دیوی کی ہم زاد خیال کیا جا سکتا ہے؛ ع کوئی ہے علّتِ اُولیٰ ،'الف' قسامِ ازل! مرزا غالب نے اس بے نام عامل کو ''تعمیر میں مضمر اِک صورت خرابی کی'' (۷) (Manufacturing Fault) قرار تو دیا مگر اس کی مزید نشان دہی کے جھنجٹ میں نہیں پڑے۔ کوئی خیال بھی ایک بچے کی طرح زمانی دورانیے کے مخصوص ادوار گزارنے پر ہی متشکل ہو پاتا ہے۔ اب ستیہ پال انند (پ:۱۹۳۱ء) کی سنیں تو وہ اسے آدم و حوّا اور ابلیس کی تثلیثی تمثیل میں ایک چوتھے کردار (Forth Dimension) کی عمل داری سے جوڑے دیتے ہیں:

''سوال یہ ہے کہ آفاق
کی تمثیل میں کیا فقط
یہ تین ہی انفاس تھے
ملوث یا اِک اور چوتھا
بھی کردار تھا ، جسے
شاید بھُلا دیا ہے
صحیفوں کی بحث میں ہم
نے کہا یہ سیب نے
باغِ جناں میں حوّا
سے 'میں پک گیا
ہوں مجھے پیڑ سے
اتارے کوئی' (۸)*

الغرض غالب ہوں کہ اقبال، وحید ہو کہ انند جی، سبھی نے کہانی کے اس ارتقائی کردار کو نشان زد کرنے کی کوشش تو بہتیری کی مگر واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ حقیقت دروپدی کی ساڑھی کی طرح کھلتے چلے جانے کے باوجود درکِ انسانی سے کماحقہ واصل نہیں ہوتی۔

خیر وجہ کچھ بھی ہو، گذشتہ نوے کی دہائی میں تہذیبی تصادم کی وہ دُرفنطنی جسے عصرِ حاضر کا نیٹشے چھوڑتا اور اسے وحی والہام گردانتے ہوئے اپنی جبلّی خصلت کو تسکین دینے کا سامان کرتا ہے، یہاں پوری طرح معرضِ تشکیک میں چلی آتی ہے۔ یہاں وحید احمد کا وہ لازمانی کردار ''رچرڈ'' ضرور یاد پڑتا ہے جسے ایسے تخریبی تعامل کی علتِ اولیٰ مان لیا جائے تو کہانی کا ایک تفہیمی قرینہ نکلتا ہے۔ اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں کچھ اسی سے ملتی جلتی فعالیت شیطان نبھاتا ہے، یہاں فرق مگر یہ ہے کہ اقبال کا شیطان تخریبی تعامل کی صرف نظری سیادت تک محدود تھا جبکہ رچرڈ اس سرگرمی میں خود پوری طرح شامل ہے۔ پھر یہ بھی کہ علامہ نے اس گھمبیرتا کا حل ایک مابعدالطبعیاتی ہستی کی صورت میں نکالا تھا مگر وحید کے ہاں یہ معاملہ تعقلاتی منطقے کی حدود میں رہتا ہے۔ اصل صورت یہی ہے کہ شعورِ آدمیت سے نابلد یا گریز پا کوئی بھی شخص فوق البشری (Super

جیسے 'ایماں کی حرارت والوں نے' ایک 'نیا شوالہ' تعمیر کر بھی دیا تو عصائے موسوی کے بغیر تجلّیاتِ کلیم کی طرف چشم و گوش کا میلان کیسے ہو گا؟۔ یہاں 'زینو' کے اعترافات کی صورت شاعر مذکور کا ایقان یہ ہے کہ کشور کشائی کے دھن میں کی گئی محاذ آرائی کے حوالے سے گیارھویں اور اکیسویں صدی میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا؛ لہٰذا لکھتے ہیں:

"مذہب کے نیاموں
میں چھپی پاکیزہ
تلواروں نے جتنے قتل
کر ڈالے ہیں اتنے
لوگ تو بیماریوں نے
بھی نہیں مارے وہی
ہتھیار ہیں کایا کلپ
ہونے سے ان کی شکل
بدلی ہے ابھی تک
چھاؤنی کے سرمئی خاکی
طویلے میں صلاح
الدین ایوبی کے
گھوڑے ہنہناتے
ہیں تو یومِ حشر کا بارود
شکموں میں اٹھائے
جوہری ہتھیار
گوداموں کی خاموشی
میں اکثر جاگ جاتے
ہیں۔"(۱۰)

واضح ہے کہ شاعر یہاں روایتی طرزِ احساس کو فکری آزادہ روی، انسان پسندی اور عالمی بھائی چارے جیسی عمومی آفاقی قدروں (Manual) خمار میں آتے ہی تصادم کی راہ چل نکلتا ہے اور یوں دنوں کے پھرنے کا دائمی عمل جاری رہتا ہے۔ اب وحید احمد کی مذکورہ نظم کا پانچواں اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ایسے تخریبی تعامل کے اہداف کا تعیینی ضابطہ واضح کیا گیا ہے:

"یہ ادھ پونے کھڑی
بالشت بونے ڈیڑھ
اینٹی مسجدی ڈھائی
کلیسائی سوا دو
راہبی آدھی دھڑی
بِھکشی دھڑا دھڑ
جنسِ بے لذت کی
صورت سوچ کی
منڈی میں قیمت
ڈھونڈتے مردار
چہروں پر نہیں آتی یہ
ان لوگوں پہ آتی ہے جو
اس کے اہل ہوتے
ہیں یہ ان لوگوں پہ
آتی ہے جو پورے
ہیں وہ جو پورے
دنوں کے ہیں۔"(۹)

اس ضمن میں وحید احمد کی نظم "صلیبی جنگ جاری ہے" بھی قابلِ حوالہ ہے۔ مذکورہ نظم میں شاعر کا پختہ تخلیقی تجربہ قاری کو تادیر عمودی پڑھت میں مصروف کیے رکھتا ہے۔ البتہ افقی قرأت کے دوران اسے یہ احساس بھی کچوکے لگاتا ہے کہ عصری سروکار سے جڑے اس موضوع کو شعریاتے ہوئے اس کے ایک مستلزم مگر مقہور بیانیے کو کیوں کر نظر انداز کر دیا گیا ہے؟ یہاں وحید

بین التونی مثالیہ استعمال کرتا ہے: ''صلیبی جنگ ہے یا میری شیلے* کا فرانکستین** ہے جو وقت کا پتلا بنا کر اس میں کالے علم کی میخیں لگاتا ہے''(۱۲)*

اسی تناظر میں کھلنے والی ساقی فاروقی(۲۰۱۸ء۔۱۹۳۶ء) کی ایک نظم ''خالی بورے میں زخمی بلا'' بھی ہے۔ یہاں متوازی اسلام ازم والوں کی خام کاریوں پر مبہم اشارے کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ذی شان ساحل (۲۰۰۸ء۔۱۹۶۱ء) کی نظم ''سینٹ اسامہ'' میں بھی فقیہانِ شریعتِ نوی سے دو ہاتھ آگے کی کوڑیاں لائی گئی ہیں جسے مانے بغیر چارہ بھی کیا رہ جاتا ہے مگر۔۔۔اور یہ مگر بہت اہم ہے۔۔۔اس نکتے پر بھی تو ادبی کلامیہ متشکل ہونا چاہیے کہ تمدن کے پردے میں آدم کشی کرنے والے نہتے انسانوں پر کیا کیا ظلم ڈھا رہے ہیں۔ع:'امانتِ نور جن کے ہاتھوں میں تھی انھی پر عذاب آیا'۔استعماری آقاؤں کی آئیڈیالوجی نے ہماری فکری قویٰ کو ایسا مرعوب کیا ہے کہ اس سارے محارباتی منظر نامے میں اپنی جان،مال اور عزت کی حفاظت کرتے مظلومین کو بھی شہید اور غازی کہنے سے خائف رہتے ہیں مبادا ان آقاؤں کے معتمد کسی مقامی ادارے کے ہاتھوں 'مسنگ پرسن' کی لسٹ میں ڈال دیے جائیں۔ کوئی جائے اور جا کر انھیں سمجھائے کہ شاعر کے بطن میں نمو پاتے فطری خوابوں کا جبری صفایا(Abortion) کچھ بھول کا چلن بھی ہو سکتا ہے!

ادبیات کی تاریخ لیکن شاہد ہے کہ ایسے ہی گھٹن کے ماحول میں مزاحمتی بیانیہ کسی نہ کسی بھیس میں پیش پر منظر غالب رہنے کے نشانات چھوڑتا رہتا ہے۔جدید متنی بصیرتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں ہیں کہ ادبی اظہارات میں در آنے والے ساکتیے ،خلائیں اور حتیٰ کہ خاموشیاں بھی معنی خیزی کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔مذکورہ عہد کی شاعری میں 'اَن کہی 'کا ایسا پیرایۂ بیان ایک حاوی محرک کے طور پر مرکزی تخلیقی دھارے کا حصہ ہے۔یہاں اس بات کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ معاصر تاریخی حقائق اور اس سے جڑی متنی تشکیلات سے ہم آہنگ کرکے اپنی تخلیقات کی فکری ساخت تیار کر رہا ہے۔جب نو آبادیاتی دور میں مذہبی رواداری کے نام پر رام رحیم کی آمیخت کا رجحان بنا تھا یا دینِ اکبری کی تغلیط میں ہمارے ہاں مذہبی حسّاسیت بڑھنے پر مناظرہ بازی سے حالات کشیدہ ہو چلے تھے تو مقامی شعرا نے صلح کل رویوں اور انسان دوستی جیسی سماجی قدروں کی بھرپور ترجمانی ترجیحی بنیادوں پر کی تھی۔اسلام میں نظری اختلاف کی بنا پر کسی جبریت کی گنجائش نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ اسی مذہبیت کو جواز بنا کر انسانیت کی تذلیل کا سامان کرنے والوں کی بھی ایک طول طویل تاریخ رہی ہے۔ اشتراکی فکر کو عملاً متعارف کرواتے ہوئے لینن (۱۹۲۴ء۔۱۸۷۰ء) نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ اسی فلسفے کی کوکھ سے عدمِ مساوات کا چنگیز پیدا ہو سکتا ہے۔آرویل(۱۹۵۰ء۔۱۹۰۳ء) کے ناول 'جانورستان' (Animal Farm) کا تھیم بھی تو اسی پیراڈاکس کا عکاس ہے جس میں مساوات کے یک نکاتی منشور پر حکومت بنانے والا جانوروں کا سردار (ایک سوّر) اقتداری مسند سنبھالتے ہی یہ اعلان کرکے کہ: ''All the animals are equal but some are more equal''(۱۱) اپنی چھن جھپٹ کے لیے استثنائی صورت نکال لیتا ہے۔

اسلام ایک دور میں مثالی ریاست کی صورت روبہ عمل رہا مگر اس عہد کا زمانی دورانیہ تو ملاحظہ ہو؟ پھر ابنِ زیاد سے حجاج بن یوسف تک سفّاک قاتلوں اور حریص شدّادوں کی ایک لمبی فہرست تاریخِ اسلام کی تقدیس کو داغ داغ کرنے کو موجود ہے۔آج بالی ووڈ کی نشاط کاریاں تو نوشتۂ دیوار ہیں اور شاید ان سے شاد کام مغربی معاشرے پر منفی کی بجائے اثرات بھی مثبت ہی پڑتے ہوں مگر عین زوال آمادہ حالت میں ہمارے 'رنگیلے پیا' کی چونچالیاں چہ معنی دارد؟ جہالت علم کا تخالفی جوڑا (Binary Opposition) نہیں بلکہ اپنی اَنانیت کے مطلقی احیا کا نام ہے۔یہی وہ عنصر ہے جس کے روبہ عمل آنے سے 'صلیبی جنگ' مسلسل جاری رہتی ہے۔لٰہذا شاعر اس افتادِ مسلسل کے لیے ایک

گرگٹ مجھ پر ایمان لا
چکے۔"(۱۳)

کبھی اقبال نے اپنی نظم 'شکوہ' میں 'بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن' کہہ کر اپنوں کی بے وفائی اور غیر آشنائی کا علامتی اظہاریہ رقم کیا تھا۔ کبھی فلسطینی مجاہدین کا باہمی کشت وخون ہوا تھا تو 'اردن' کے عنوان سے احمد ندیم قاسمی (۲۰۰۶ء۔۱۹۱۶ء) اس درونی خلفشار کا نوحہ لکھتے ہوئے یہ فکر انگیز استفہامیہ بھی شعریاتے ہیں کہ ہم پہ اٹھنے والے ہاتھ یوں تو ہمارے ہی ہیں مگر سوچنا یہ چاہیے کہ ان میں پکڑے خنجر کن کے ہیں۔ منیر نیازی (۲۰۰۶ء۔۱۹۲۸ء) اور بالخصوص فیض احمد فیض نے اشتراکی افکار کی طرف میلانِ طبع رکھتے ہوئے ایسے اشعار اکثر موزوں کیے ہیں۔ آج اسی روایتی مداخلت کاری کے تسلسل میں نو استعماری دور کی مرکز گریز حرکیات کو اس شعری بیانیے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر خالد اقبال یاسر (پ: ۱۹۵۲ء) نے اس استحصالی نظامِ عالم کو "کمپیوٹر کی ری سائیکل بن قرار دیا تھا جو پروگراموں کو نہیں بلکہ کمزور اقوام و ملل کو ری سائیکل بِن میں ڈالتا ہے تاکہ وہ کی بورڈ (Key Board) پر گھڑے گھڑائے اس کی انگلیوں پر ناچتے رہیں۔"(۱۴)

اب اپنے مخالفین کو مخاطب کر کے اور انھیں سِول اور عسکری اسلام کے حوالے سے آگہی دے کر 'راہِ راست' پہ لانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ یہاں اس کی عملی مثال کے لیے پاکستان کی مثال دی گئی جسے افغان جنگ کے دوران مالی امداد کے بدلے فرنٹ لائن سٹیٹ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ایک آلہ کار بنالیا گیا:

"اے برف دھونکنے
والے ہٹ دھرمو!
کیا تم ان سے بڑے
مسلمان ہوذرا
پاکستان کے حاکمو سے

میں در آنے والے مابہ الامتیاز کے یہی نشانات نوتاریخی پڑھت کا خاص سروکار ہیں اور ایسی ہی قرأتی سرگرمی کا ماحصل یہ ہے کہ ادبی بیانیہ معاصر سماجی منظر نامے کی سادہ عکاس نہیں ہوتا۔ کبھی اکبر الہ آبادی نے 'شاہدِ معنی' کو 'ظرافت کا لباس' پہنا کر ردِّ استعماریت کا حق ادا کیا تھا تو موجودہ نواستعماری منظر نامہ اسے احمد جاوید (پ: ۱۹۵۴ء) کے سے معکوسی بیانیے کی اوٹ میں تسطیر کرنے کی راہ سدھاتا ہے۔ مذکورہ شاعر کی ایک نظم "صدر بش کا خطبۂ جمعہ" میں نواستعماری جال میں چھید کرنے والے ایسے 'نان سٹیٹ ایکٹرز' اور متوازی اسلامیت پسندی (Parallel Islamism) کے ضمن میں استعماری موقف واضح کیا گیا ہے۔ یہاں خطبۂ جمعہ کے اسلامی شعار کو صدر بش سے انسلاک دینے میں یہ نکتہ بھی مخفی ہے کہ آج قوّت ہی خیر کے منصب پر فائز ہے۔ نظم کے تمام اجزا معنوی حوالے سے بڑے پُر مغز (Pregnant) ہیں اور بنا بریں الگ الگ تعبیر و توضیح کے متقاضی بھی۔ یہاں علامہ اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کی طرز پر ایک نظری فریم ورک کو اطلاقی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ غالباً اسی تکنیکی تقاضے کے پیشِ نظر شاعر کو اس نظم میں بھی مختلف سلائیڈز بنا کر ایک فلمی تسلسل کی طرز وضع کرنا پڑی جس سے ایک ہی بیانیہ کئی حصوں میں بٹ کر ایک ساخت کی صورت متشکل ہونے لگتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو ان تمام اجزا میں ایک آپسی مسابقت (Competitiveness) بھی موجود ہے۔ اب ذرا اس نظم کی مختلف سلائیڈز ملاحظہ کیجیے:

"واقعی میری بڑی
شان ہے کویت کے
سارے مینڈک، قطر
کے تمام بجّو اور
بحرین کے سب

پوچھو اس اجر عظیم
کے بارے میں جو
انھیں میری قدم بوسی
کے طفیل ملا
ہے۔"(۱۵)

کبھی علامہ اقبال نے اپنی شاعرانہ رمزیت میں کہا تھا کہ آغا خانی طبقہ ہندوستان سے مشاورتی وفد اپنے ہاں اس لیے طلب کرتا ہے کہ ان کے ساتھ ساز باز کر کے مذکورہ ممالک کو ہڑپ کیا جا سکے۔ آج سازشی طبقہ کھلے بندوں اپنے نواستعماری آقاؤں سے میل ملاپ میں رہتا ہے (بعض خواص معتمدین نے تو مستقل اقامتیں ہی اپنے آقاؤں کے اڑوس پڑوس منتقل کر لیں ہیں) مگر کوئی تو غیر مرئی طاقت ایسی ہے جو انھیں متنی تشکیلات کا یوں کھل کر حصہ نہیں بننے دیتی۔ یہاں 'اجر عظیم' سے وہ معاشی امداد مراد ہے جو مشرف دور میں فراہم کی گئی اور بدلے میں سرزمینِ پاک کو اپنے عسکری اہداف حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ پاکستان کی مالی امداد کا واقعہ ایسا دلچسپ ہے کہ اس کی تہہ در تہہ رمزیں ایک ایک کر کے کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں ذی شان ساحل نے "پریسلر ترمیم2" کا ادبی ترجمہ کچھ یوں کیا تھا: "دوست ملکوں کو خاص طور پہ پاکستان کو دی جانے والی امریکی امداد فوراً بحال کر دی جائے۔"(۱۶)مستعمرہ ممالک کو ملنے والی 'معاشی امداد' فی الاصل وہ پھانس (Bait) ہے جسے نگلنے سے پوری مچھلی مچھیرے کی انگشت کے تابع ٹھہرتی ہے۔ اس ضمن میں Kwame Nkrumah(۱۹۰۹ء-۱۹۷۲ء) کا تجزیہ ملاحظہ فرمائیں:

"Aid, therefore to a neo-colonial state is merely a revolving credit paid by the neo-colonialist masters, passing through the neo-colonialist state and returning to the neo-colonialist master in the form of increased prophet."(17)

مذکورہ نظم کی اگلی لائنوں میں خطیبِ مغرب اپنے اتحادیوں کے بارے میں گویا ہوتے ہیں: "کیا یہ اعجاز نہیں کہ میرے سب خانہ زاد سرِ دست موت کی رسوائی سے محفوظ ہیں۔"(۱۸)یعنی موت کی رسوائی کے سوا باقی ہر نوع کی رسوائیاں ان کی حیاتِ موہوم کا لازمہ بنا دی گئی ہیں۔ ان کی رسوم و اقدار، نظامِ معیشت، سماجی ساخت، زبان اور اس میں در آنے والا نوزائیدہ فکر و فلسفہ سب ہمارے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ جب چاہیں کسی بھی ملک کو فرنٹ لائن سٹیٹ بنا کر اس کی سرحدی توقیر کو خاک میں ملا دیں۔ مستعمرہ آبادی کی تذلیل

خواب غیر حاضر
سامعین سن لیں
زمین کی چادر پر جگہ
جگہ دھبے پڑ گئے ہیں
افغانستان،ایران،
عراق،شام اور ہاں
پاکستان بھی یہ سب
غلاظت کے جزیرے
ہیں"(۱۹)

واضح رہے کہ یہاں ملائشیا،انڈونیشیا،مصر او تیونس جیسے ممالک کا نام نہیں لیا گیا کیوں کہ ان میں اسلامی جمہوریت کا ایک غیر عسکری ماحول بنا جاتا ہے۔مصر میں اسلامی اخوت نام کی جماعت (Muslim Brotherhood Party)کو قدیم ترین اسلامی تحریک قرار دیا جاتا ہے۔اسی طرح تیونس میں راشد الغنوشی(پ:۱۹۴۱ء) کی نشاۃ ثانیہ پارٹی (Ennahda Party)سیاسی عمل کو اسلامائیز کرنے کے حوالے سے بڑی شہرت رکھتی ہے۔ان ممالک کی اسلامی جمہوریت کو اعلیٰ حضرت جنابِ بُش(پ:۱۹۶۴ء) کی بارگاہ میں پزیرائی دی جاتی ہے۔اس معمے کی عقدہ کشائی کے لیے اگر علامہ اقبال کے جمہوریت اساس نظریات سے رجوع کریں تو معلوم ہو گا کہ اس نظام میں تعددی برتری کو انتخابی معیار ماننے سے ملوکیت کا احتمال ہمیشہ بنا رہتا ہے تاہم اسلام میں انتخابِ خلافت کے متنوّع طریقوں سے اشارہ ملتا ہے کہ زمانی تقاضوں کے مطابق اسلامی جمہوریت کے یہ تجربات بلادِ اسلامیہ کی اجتماعی تنظیم سے ہم آہنگ ہو کر ملی نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

مذکورہ نظم کی اگلی لائنوں میں جن ستاروں کے ظاہری و باطنی فرق سے آگاہی دی گئی ہے وہ دراصل نواستعماری کلامیے سے مفاہمت کر لینے والے علماء و مشائخ ہیں۔فرازز فینن نے بھی یہ قضیہ کاری تو خیر نوآبادی دور کی شروعات سے کی جاری تھی اور "اِنّ الملُوک" والی محکم آیت کی صورت میں سمجھ بھی آتی ہے،اسی لیے رڈیارڈ کپلنگ نے نوآبادی باشندوں کو گورے آدمی کے لیے بوجھ قرار دیا تھا۔اب یہ عمل دہرایا جاتا ہے نظم کی اگلی لائن میں اپنی نظریاتی جڑوں سے کٹے ہوئے طبقات کو اپنے 'وفادار کتے' قرار دے کر سرِ بازار رسوا کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ مستعمرہ باشندوں کے لیے حیوانی استعارات کا استعمال نو آباد کاروں کی استحصالی پالیسی کا ایک لازمی نفسیاتی حربہ رہا ہے جس کی مثالیں ہمارے کلونیل دور کے ادب میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔یہ بند اس بنا پر بھی اہم ہے کہ اس میں جن 'بیچارے مسلمانوں' کو مخاطب کیا گیا ہے وہ اپنی غیر سرکاری اسلام پسندی کی وجہ سے موصوف کی نظر میں ناپسندیدہ ہیں۔اگرچہ اب یہ طبقہ بے چارگی کی حالت میں ہے مگر اپنی نظریاتی پختگی کے حوالے سے ان کا تعلق اسامہ،الظواہری(۲۰۲۲ء۔۱۹۵۱ء) اور زرقاوی (۲۰۰۶ء۔۱۹۶۶ء) جیسے انھی 'نان سٹیٹ ایکٹرز' سے جا ملتا ہے جنھیں اس کے وفادار مسلمانوں سے شدید اختلاف رہا۔یہ وہی روایت پسند گروہ ہے جو رنگ، نسل اور زبان وغیرہ کی بنیاد پر بننے والی ریاستی شناختوں کو نہیں مانتے۔یہ اپنے دیس کو اسلام بتاتے ہیں اور تشخص کے مصطفوی ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔یہ ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کا وہی خواب پالے ہوئے ہیں جو ان کے سلف صالحین نے دیکھا اور ایک خاص تناظر میں اقبال جس کی تشویق و ترویج کرتے رہے۔اس ذہنیت کے لوگ جن ریاستوں میں زیادہ تر آباد ہیں انھیں 'غلاظت کے جزیرے' کہا جاتا ہے مذکورہ بند ملاحظہ کیجیے:

"بیچارے مسلمانوں
کے پاس بس ایک
خواب رہ گیا ہے
میرے وفادار کتوں
کی لاش پر تھوکنے کا

ممبر ہے اور ممبر کا
فیصلہ ہےاور اب جو
ممبر کا فیصلہ ہے وہ قولِ
صادق سے مختلف
ہے''(۲۲)

مذکورہ نظم میں اس کے بعد بُش اپنے بدترین مخالفین کو مغضوب العضب لہجے میں مخاطب کرتے ہیں: ''اے اسامہ،اے ظواہری،اے زرقاوی! تم مردہ بجلیاں ہو،پتھرائے ہوئے طوفان مجھے تم پر ترس آتا ہے''(۲۳) یہاں قاری کی توجہ سطور سے زیادہ بین السطور معنویت کی طرف کھنچی جاتی ہے ۔ان مقہور کرداروں کا مجموعی تعارفیہ یہی کچھ ہے جسے مقتدر بیانیے کے تشہیری ذرائع پوری دنیا میں پھیلا رہے ہیں۔اردو شاعری میں ان مسلم عسکریت پسندوں کی تحسین و تنقیص کے باب میں برائے نام سا متن تسطیر ہونا بذاتِ خود معنی خیزیت کا باب ہے۔ع 'کہانیوں کے وہ کردار جو لکھے نہ گئے'۔یادش بخیر! مرزا غالب کبھی جنگِ آزادی کو 'غدر' کے معنوی وزن پر 'رستاخیزِ بے جا' کے طور پر باندھتے تھے مگر اسی بے جا رستاخیز نے اس بلبلِ شوریدہ پر ایسا سحر باندھا کہ تاوقتِ آخر ڈھنگ کے دو چار فن پارے بھی ارزاں نہ کر سکے۔یہ نظم اس صورتِ واقعہ کی بھی غماز ہے کہ موجودہ سائبر دنیا میں میڈیا کے جدید ذرائع کی مدد سے مخصوص تشکیلی حقیقتیں متعارف کروائی جاتی ہیں۔آج اگر امریکہ،اسرائیل،فرانس اور برطانیہ جیسے استعماری ممالک محض تشکیلی تعامل سے تہذیب و تمدن کے مراکز ٹھہرائے جارہے ہیں تو دوسری طرف عراق،افغانستان اور ایران جیسی مستعمرہ مملکتوں کا شناختی تشخص بھی وہ نہیں جو میڈیا کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''انفرمیشن ٹیکنالوجی
کی قبا میں مغربی

اٹھایا تھا کہ ''مقامی باشندوں کو پر سکون رکھنے کے عمل میں نو آبادیاتی سرمایہ داروں کی امداد مذہب کی جانب سے بھی کی جاتی ہے۔ان تمام ولیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جنھوں نے دوسرا گال پیش کیا ہے۔۔۔اور انھیں نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔''(۲۰) کبھی اقبال نے ان کے لیے 'ابلۂ مسجد' کی تخفیفی ترکیب موزوں کی تھی۔اشتراکی روس میں ایسی مذہبی فضا کا جائزہ لیتے ہوئے ایک محقق نے مساجد کو علماء کی ورکشاپیں(Work Places of Ulma's)اور اسلام کی آزادانہ نظریاتی بصیرت پر اپنے سرپرستوں کی سوچ کو ترجیح دینے والے علماء کو سرکاری کٹھ پتلیاں (Puppets of the States)قرار دیا ہے۔(۲۱) اسلامی روایات میں جن تین چیزوں میں خرابی در آنے پر نظامِ عالم متاثر ہونے کی بات کی جاتی ہے ان میں سے ایک عالم کا غلطی کرنا بھی شامل ہے لیکن اگر ممبر و محراب دانستہ کسی استحصالی نظام سے سمجھوتے میں ملوث ہوں تو اعتبارِ حرم کی عافیت معلوم! ایسے منظم استحصالی نظام کے خلاف عوامی حکمتِ عملی کو عموماً دانشور مخالف رویے(Anti-Intellectualism)کا نام دے لیا جاتا ہے مگر یہی حاشیائی رویہ لوک دانش کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے۔اس ضمن میں افتخار عارف (پ:۱۹۴۳ء) کی ''ابوذر غفاری کے لیے ایک نظم'' ملاحظہ کیجیے:

''سلام ان پر درود ان
پر وہ کہہ رہے
تھے زمیں نے بوجھ
ایسے آدمی کا نہیں اٹھایا
جو تم سے سچا ہو اے
ابوذر! ۔۔۔مگر
زمانے نے یہ بھی
دیکھا وہی مدینہ
ہے،اور ابوذر ہیں اور

کی سرگرمیاں عوامی احساسات سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب مذہبی علما حالات سے سمجھوتہ کرکے حق و صداقت کا استعاروں سمجھے جانے والے ممبر و محراب کی چمک دمک کو گہنا دیں گے تو سماج کی فکری ساخت میں فرق تو آئے گا۔ علامہ اقبال نے آج سے ایک صدی قبل ایسی ہی ملی بے حسی کی بنا پر 'امتِ مرحوم' کی ترکیب موزوں کی تھی۔ موجودہ دور میں مختلف حیلے بہانوں سے مسلمان ریاستوں کی مقتدر حیثیات کو جس طرح پائمال کیا جارہا ہے اور اس پر کسی اجتماعی ردّعمل کا سامنے نہ آنا اسی 'امتِ مرحومہ' کی صد سالہ فاتحہ کہنے کے سوا اور کیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی (پ: ۱۹۵۰ء) نے ایسے میں مسلمان ملکوں کی نظریاتی بے حسی دیکھتے ہوئے 'امتِ مظلمہ' کی عبرت ناک ترکیب باندھی تھی:

''ماتھے پہ چٹیں لگی
ہوئی ہیں ہاتھوں میں
کاسۂ گدا ہے حلقومِ
برادراں پہ خنجر اور لشکرِ
دشمناں میں جا
ہے عبرت کیشو! نگاہ
کرنا یہ امتِ شاہِ دوسرا
ﷺ ہے'' (۲۶)

اس کے مقابل اسرائیل بھی ایک نظریاتی ریاست ہے جو اقبال ہی کے ہمعصر ہیزل (Theodor Herzl 1860-1940) کی فکری کاوشوں سے وجود میں لائی گئی۔ آج امریکہ سمیت ساری یورپی قیادت ''پنجۂ یہود'' میں آچکی ہے۔ استعماری زیرکی کے اس شاہکار ملک نے عرب سرزمین کے عین وسط میں کھلبلی مچار کھی ہے۔ فلسطینی باشندے اپنے ہی دیس میں اجنبی بن چکے ہیں۔ سلامتی کونسل کا وہ ادارہ جس نے کبھی عراق پر پابندیاں لگوانے میں بڑی فعالیت دکھائی تھی، اس چھوٹے سے ملک کو نکیل ڈالنے میں بے بس

تہذیب کا دیو استبداد
چھپا ہوا ہے۔ یہ باقی دنیا
پر ہر ثقافتی غلبے کے
حصول کا ایک نیا حربہ
ہے اور اگر اس کی رفتارِ
ترقی پر روک نہیں
لگائی گئی تو تخلیقی
وجدان کے حق میں
اچھا نہیں ہوگا''(۲۴)

فلسطینی منظر نامہ امتِ مسلمہ کی نظریاتی اجتماعیت کے لیے ایک تجربہ گاہ بنا ہوا ہے مگر امتحان میں بیٹھنے کو تیاری چاہیے۔ رئیس امروہوی (۱۹۸۸ء۔۱۹۱۴ء) نے کچھ غلط نہیں کہا تھا:

جو اہلِ فلسطین کو خطرے سے بچائے — وہ عزم، وہ تحریک، وہ اقدام کہاں ہے
اب عالمِ اسلام کو اٹھنے کی ضرورت — بے شک ہے، مگر عالمِ اسلام کہاں ہے (۲۵)

کبھی نو آبادیاتی دھونس کو پسپائی پر مجبور کرنے کے لیے ترکِ موالات کی تحریک بڑی کامیابی سے چلائی گئی تھی۔ فلسطین کے موجودہ منظر نامے پر بھی اہلِ مغرب کے اعتدال پسند اور انسانیت دوست طبقے کی طرف سے نہایت ذمہ دارانہ فعالیت دکھائی گئی مگر دوسری طرف 'ایماں کی حرارت والوں نے' سے اتنا نہ ہوا کہ مقتدر حلقے اس وحشت زدگی پر اسرائیل کے خلاف اپنی یک جہتی قائم کر دکھاتے؛ عوام الناس میں صیہونی مصنوعات کے بائیکاٹ کی کوئی تحریک ہی چلاتے؟ ایسے میں عوامی حلقوں اور وہ حکمران طبقات میں نقطۂ نظر کا واضح اختلاف در آتا ہے اور وہ اپنے مقتدر طبقات کو بشمول ان کے دینی یا دنیوی حمایتی علمی حلقوں کے بنظرِ تشکیک دیکھنے لگتے ہیں۔ اس فکری اختلاف کا فائدہ ان غیر ریاستی گروہوں کو پہنچتا ہے جن

زرد جسموں میں ہماری
آتمائیں تھک چکی
ہیں۔''(۲۷)

دعا ہمارے مادی قویٰ کو ماورائی امکانات سے جوڑتی ہے۔غلامی میں ہمارے ضمیروں کی ایسی کایا کلپ ہوئی کہ ایقانات کا محور بتدریج بدلتے بدلتے زمینی خداؤں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ مسجدوں،خانقاہوں کی تعداد بے تحاشا بڑھ رہی ہے اور ان میں عوم الناس کی ریل پیل بھی خاصی حوصلہ افزا؛واقعہ مگر یہ ہے مذکورہ مقدس جگہیں نواستعماریت کی ضابطہ گردی میں آکر بڑی حد تک اپنی آزادانہ فضا پر سمجھوتہ کر چکی ہیں۔اسلامی ممالک میں بھی مذہب کو ریاستی ضابطوں میں رکھنے کی روش عام ہو چکی ہے۔جب کسی قوم کا روحانیت کے اصل جوہر سے رشتہ کمزور ہوتا جائے گا تو دعاؤں کی استجابیت معلوم۔

یہ نظمیں اس بات کا بین ثبوت بھی فراہم کرتی ہیں کہ مسلمانوں کے دنیاوی زوال کی علتِ غائیہ کیا ہے۔مابعد الطبعیاتی ہستی سے اس کا تعلق کیونکر کمزور ہو چکا ہے۔مسلمانوں کے نکبت واد بار میں گھر جانے پر غار کے دھانے کا پتھر کیوں نہیں ہٹ پارہا۔خدا کو معبود ماننے والوں کو نئے زمانے کے ابرہہ سے بچانے کے لیے ابابیلیں کیوں نہیں پہنچتیں؟ کبھی علامہ اقبال نے مولانا حالی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ''جوابِ شکوہ'' اور ''خضرِ راہ''وغیرہ میں ایسے قومی استفسارات پر مروجہ شعریات کی سیادت میں بات کی تھی؛آج مگر شعریاتی منشور تغیر و تبدل کے کئی مراحل سے گزر رہے ہیں۔حالی اور اقبال کے دور میں مذہبی ایقانات کی کارفرمائی سے شعری تخلیقات میں ادبی مکاشفات کا رنگ خوب گہرا تھا مگر معاصر ادبی منظر نامہ ایسے رنگ وروپ سے بھی بالکل عاری نظر آتا ہے۔دراصل ایسے مکاشفات اجتماعی حافظے کا ثمرہ ہیں جن سے اسلامی تہذیب کی ثروت مندی پر اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔آج ایسی ایسی اُفتاد پڑنے پر بھی ہمارا نظر آتا ہے۔ادھر امتِ مسلمہ کی رٹ لگانے والے مسلم ممالک ایسے پیغمبری وقت کے آن پڑنے پر صاف غچّہ دیے جاتے ہیں۔یادش بخیر! مرزا غالب نے ایسی ہی نادیدنی کی دید سے دل کے خون ہونے کا مضمون باندھتے ہوئے 'دیدۂ بینا' سے ہی معذرت کر لی تھی۔اسی کرب ناک صورت کی عکاس علی ارمان(پ:۱۹۷۳ء) کی ایک نظم ''ایاک نعبد وایاکَ نستعین''ملاحظہ کیجیے:

''ہماری بے بسی وہ غار
ہے جس کے دھانے
پر پڑا پتھر نہیں
ہلتا ہمیں تو اپنی جتنی
نیکیاں بھی یاد تھیں
گنوا چکے اب کیا
کریں ؟اب تو
ہمارے لب مقدس
آیتوں کا ورد کرتے
کرتے پتھر ہو چلے ہیں
اور زباں پر آبلے
پڑنے لگے ہیں ناامیدی
کے۔۔۔اس
اندھیری غار میں ہلکا سا
روزن تھااسے بھی
اب کسی بندوق کی نالی
سے بھر دینے کی
کوشش ہو رہی
ہے کوئی رستہ نہیں
ملتا نگاہوں اور پاؤں
کو اور ہمارے

زخموں پہ کسی قسم کا
مرہم رکھنا ہے۔ آپ
انھیں ایک نسبتاً کم خود
مختار اور نسبتاً کم
جمہوری معاشرے مگر
آزاد ملک کے خلاف
ایک نسبتاً زیادہ خود
مختار اور نسبتاً زیادہ
جمہوری مگر آزاد
ریاست ہائے متحدہ کی
عسکری پیش قدمی اور
غاصبانہ فتح پر ایک
محدود اور کمزور احتجاج
کی آواز تصور کر سکتے
ہیں''۔(۲۸)

عالمی گاؤں میں کوئی ایسی جگہ تو رہنی چاہیے جہاں 'بستی کے لوگوں سے نفور' حاشیائی افراد اپنی مرضی سے زندگی کر سکیں۔ کیا ثقافتی استعماریت کے جبری اثر و نفوذ سے لوگوں کو تشویش و تحفظات (Anxiety of Influence) پالنے کا کوئی حق نہیں؟ الغرض ایسے حربی بیانیوں میں لپٹی ربع صدی کے اس مختصر سے دورانیے میں اردو شاعری مسلمانوں کے اجتماعی فکر و فلسفے کے حوالے سے نئی حسیّت سے ہم آہنگ ہوئی ہے۔ آج سے ٹھیک ایک صدی قبل جب ملتِ اسلامیہ حالتِ نزاع میں آئی تو حکیم الامت علامہ محمد اقبال نے اس کے مرضِ کہن کی تشخیص اور حسبِ ضرورت علاج معالجے کے سلسلے میں جو سعیِ بلیغ فرمائی تھی، فی زمانہ اس میں بدلاؤ نہیں کچھ اختلاف ضرور تجویز کیا گیا ہے۔ نو استعماری فضا میں اردو شعرا نے روایتی ملّائیت کے نظری حصار کو یکسر توڑتے ہوئے فکری آزادہ شاعر اگر اسلامی روایات میں تواتر سے وارد ہونے والی غلبۂ اسلام کی بشارتوں کے زیرِ اثر اپنی تخلیقات میں ادبی مکاشفات کے کچھ نشانات چھوڑنے میں ناکام نظر آتا ہے تو یہ صورتِ واقعہ معنی خیز ہے۔ آج ہماری اردو شاعری کی روایتی شعریات جدیدیت کی متعارفہ آزادہ روی اور انسانیت دوستی کی اشتراکی قدروں سے ہم آہنگ ہو کر ندرتِ فکر و فن کا نمونہ پیش کر رہی ہے۔ لہٰذا مذکورہ واقعات کے تناظر میں تخلیق ہونے والی بیشتر نظموں میں روایتی مذہبی تناظر کو مستلزم نہیں جانا گیا۔ بلاشبہ یہاں کئی ایک شعرا کی مستثنیات بھی موجود ہیں مگر عمومی تاثر تو اجتماعی تخلیقی دھارے سے ہی متشکل ہو گا۔

نو استعماری عہد کی اکثر نظموں کے جدید فکری ساختیے سے یہ حقیقت بھی منکشف ہونے لگتی ہے کہ نو استعماریت کا جبری بیانیہ ان کی متنی تشکیل پر بھی اپنے اثرات مرتب کر رہا ہے۔ اس کے لیے ذیشان ساحل کے ایک شعری مجموعے (جو کہ عراق پر جنگ کے دنوں میں لکھا گیا تھا) کے دیباچے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جو بظاہر واقعے سے فنکارانہ علیحدگی (Artistic Detachment) سے بھی کچھ زیادہ دوری کا عکاس لگے گا مگر فی الاصل جس میں اسلامی اور ہر نوع کے دوسرے 'ازمی' تعصبات سے بالاتر ہو کر مذہبِ انسانیت کی رو سے سامنے کے محارباتی منظر کی تفہیم کرنے اور ماحصل کو 'کثرتِ تعبیر' سے بچانے کی استدعا کی گئی ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ کسی واقعے کو اپنی مخصوص ذہنی تشکیلات سے جوڑنا بڑی معیوب بات ہے:

''یہ نظمیں برادر
اسلامی ملکوں سے اظہارِ
ہمدردی یا تعزیت
کرنے کے لیے نہیں
لکھی گئی ہیں اور نہ ہی
ان کا مقصد دم توڑتی
ہوئی انسانیت کے

برآں یہاں ملتِ اسلامیہ کی اٹوٹ نظریاتی اساس کو قائم رکھتے ہوئے اسے جغرافیائی عوامل سے ہم آہنگ کرکے بتدریج ملی وفاقیت (Islamic Federation) میں ضم کرنے اور اقوامِ مشرق کی نئی صف بندی کے لیے اسلام اور اشتراکیت کو قریب لانے ضرورت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ پہلے نگارِ ہستی اپنی کوئی تازہ ادا سامنے لاتی ہے، پھر اس کا اچھا سا کوئی نام بھی رکھ لیا جاتا ہے۔

ع: بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

حواشی وتعلیقات

۱۔ ضیاالحسن، ڈاکٹر، ناصر عباس نیّر: پیش لفظ، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اردو زبان و ادب، (لاہور: کلیۂ علوم شرقیہ، اورینٹل کالج، ۲۰۰۸ء)، ۱۱

2 Huntington, S. P. (1993). Clash of Civilizations and the Making of World Order. Simon & Schuster. (p. 47)

3 Mayer, W. D. (2018). Colonialism and Islam: Western Perspectives on Soviet Asia. Proquest LLC. (p. 221)

۴۔ مبارک شاہ، سیّد: کلیات مبارک شاہ، (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۷ء)، ۱۲۴

۵۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۶۔ راشد، ن م: کلیاتِ راشد، (لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء)، ۵۲۱

۷۔ بہ رعایتِ شعر: مری تعمیر میں مضمر ہے اِک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا (غالب)

روی، انسان پرستی اور عالمی بھائی چارے جیسی عمومی آفاقی قدروں کو اپنے مرکزی فکری دھارے میں جگہ دی ہے۔ محلِ نظر نکتہ یہ ہے کہ استعماریت کے مزاحم کرداروں کو سراہنے کی جو روایت ایک تسلسل کے ساتھ اردو شاعری کے مرکزی دھارے میں موجود رہی، اسے نواستعماری سحر کے زیرِ اثر یاروں نے ایسا فراموش کیا ہے کہ 'وعدۂ الست' کے نسیان کو بھی مات دے دی گئی۔ کیا یہ اسی سحر کی کارفرمائی نہیں کہ استعماری لاؤ لشکر کے کسی بھی مسلم مزاحمت کار کی شہادت پر ہم ایسا خراجِ عقیدت پیش نہیں کر پائے جیسا کبھی پلاسی کے میدان میں شہید ہونے والے سراج الدولہ کو رام نرائن موزوں نے ''غزالاں تم تو واقف ہو۔۔۔''(۲۹) جیسے ادبی تاریخیت کے شاہکار شعر میں پیش کیا تھا۔ یادش بخیر! کبھی ڈاکٹر محمد دین تاثیر (۱۹۵۰ء۔۱۹۰۲ء) نے ''پاکستان کے ادیبوں کے فرائض'' پر بات کرتے ہوئے لکھا تھا: ''۔۔۔ہر وادی میں، ہر قریے میں جہاد کی حیات پرور کہانیاں آباد ہیں۔ کوئی ہے جو ہمارے اہلِ قلم کو زندگی کے اس رخ سے روشناس کرائے۔''(۳۰)

یہ بات تو شاید بطورِ خاص اب جتارنے کی بھی نہیں رہی کہ یہودیوں کے ساتھ نازیوں کے ظالمانہ برتاؤ کو آج تک 'ہولوکاسٹ' کے نام سے ایک دائمی رثائیت کے بیانیے میں یاد کیا جاتا ہے تو فی زمانہ جب مشرقی یورپ، مشرقِ وسطیٰ اور برصغیر میں مسلم نسل کشی (Ethnic Cleansing) کی صورت ایک نئی 'ہولوکاسٹ' جاری ہے تو اس کے لیے صیہونی دہشت گردی کی تلازماتی لفظیات تخلیقی دھارے کا حصہ کیوں نہیں بن پا رہیں؟ ظاہر ہے کہ یہاں نواستعماریت کی 'مبادیاتِ وحدت الوجود' روبہ عمل ہیں۔' اس شاعری میں غیر ریاستی اداروں کی استعماریت مخالف سرگرمیوں کی متنی تشکیل میں ذمہ دارانہ رویہ اپنایا گیا ہے مگر ایسے رویے کے اہتمام کی وجوہات کچھ زیادہ سادہ بھی نہیں۔ عوامی جذبات پر ریاستی بیانیے کا دباؤ بھی بین السطور واضح طور پر موجود ہے۔ مزید

۸۔ فاطمہ حسن(مرتب): ستیہ پال انند کی ساٹھ منتخب نظمیں ،(کراچی: شہر زاد،۲۰۱۵ء)،۱۶

- رومائے قدیم کے ادب میں سیب ایک ایسا آفاقی سمبل ہے جسے عورت کے جسم میں بلوغت کی پہلی بیداری سے مماثلت دی جاتی ہے۔

۹۔ وحید احمد: پریاں اترتی ہیں، طبع دوم،(راولپنڈی: رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،۲۰۲۰ء)،۷۰

۱۰۔ وحید احمد: پریاں اترتی ہیں، ص۳۹

11. Orwell, G. (2006). Animal Farm. Paguine Random House. (p. 86)

۱۲۔ وحید احمد: پریاں اترتی ہیں، ص۳۸

- میری شیلے انگریزی شاعر پی بی شیلے کی اہلیہ تھی جس کا ایک معروف کرداری ناول " Frankenstein" ہے۔یہ کردار دراصل ایک بھوت ہے جسے مردہ گوشت اور ہڈیوں کے ملغوبے سے بنایا گیا۔پھر جو میری نے برقی رواس پتلے سے گزاری تو وہ نہ صرف زندہ ہو گیا بلکہ ہر طرف فتنہ فساد اور تخریبی سر گرمیاں پھیلانے لگا۔اب اسے مارنا بھی ممکن نہ رہا تھالہٰذا یوں وہ کردار دائمی شر پسندی اور تخریب کاری کی علامت ٹھہرا ۔فرانکستین دراصل اسی کردار کا مؤرد نام ہے جس کی ترید اسلوبی ضرورت کے تحت وحید احمد نے خود کی ہے۔(محترم وحید احمد نے اس ضمن میں کچھ بات چیت (بتاریخ۱۸ جولائی۲۰۲۴ء) راقم سے برقی مواصلات کے ذریعے کی تھی)

۱۳۔ احمد جاوید: آندھی کا رجز،(کراچی: شہر زاد،۲۰۲۲ء)،۱۷

۱۴۔ یاسر، خالد اقبال، ڈاکٹر: ادب اور زمانہ،(لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ،۲۰۱۴ء)،۳۸

۱۵۔ احمد جاوید: آندھی کا رجز، ص۱۷

۱۶۔ ساحل، ذی شان: ساری نظمیں،(کراچی: آج کی کتابیں ،۲۰۱۱ء)،۲۴۰

17. Nkrumah, K. (1966). Neo-Colonialism, The Last Stage of Imperialism. International Publishers Co., Inc. (p. xv)

۱۸۔ احمد جاوید: آندھی کا رجز، ص۴۲

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ محمد پرویز، سجاد باقر رضوی (مترجمین): اُفتادگانِ خاک،(لاہور: نگارشات،۱۹۹۶ء)،۶۱

21. "...unswerving sport for the state action made it possible to present the Ulma as puppets of the state and not representative of the wider Islamic community."

Mayer, W. D. (2018). Colonialism and Islam: Western Perspectives on Soviet Asia. Pro Quest LLC. (p. 219)

۲۲ افتخار عارف: کتابِ دل و دنیا،(کراچی: مکتبہ دانیال،۲۰۱۷ء)،۱۳۸

۲۳ احمد جاوید: آندھی کار جز، ص ۲۷

۲۴۔ شمیم حنفی: اردو ادب کی موجودہ صورت حال، مشمولہ: شعر و حکمت،(حیدر آباد (بھارت)، مارچ ۲۰۰۱ء)،۲۸

۲۵۔ رئیس امروہوی: قطعہ، مشمولہ: روزنامہ جنگ، ۱۹ اکتوبر ۲۰۲۳ء

۲۶۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر: شاخِ زریاب،(لاہور: یونیورسل بکس، ۲۰۱۹ء)،۵۶

۲۷۔ علی ارمان: اِیاکَ نَعبُدُ وَاِیّاکَ نَستَعِین (نظم)، مشمولہ: دال دلیا(کالم)، از: ظفر اقبال، روزنامہ دنیا، یکم اکتوبر ۲۰۲۳ء

۲۸۔ ساحل، ذی شان: ساری نظمیں، ۲۷۲

۲۹۔ موزوں کا محولہ شعر: غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

(محمود شیرانی (مرتب): تذکرۂ شعرائے اردو،(لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۳۳ء)،۱۵۰

- غزالاں نے بعد از مجنوں صورتِ صحرا کا ماجرا کیا بیان کیا، ادبی تاریخ اس ضمن میں خاموش ہے؛ یہ روایت ضرور ملتی ہے کہ پورے بنگال پر لارڈ کلائیو کا قبضہ ہو جانے پر خود موزوں نے پٹنہ کے دیوان کا عہدہ ضرور سنبھالے رکھا تھا۔(صفدر میر: آخر شب کے ہم سفر،(لاہور: کلاسیک، ۱۹۷۸ء)،۱۱

۳۰۔ ممتاز اختر، مرزا (مرتب): مقالاتِ تاثیر،(لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۸ء)،۵۲

Bibliography

1. Ahmad, J. (2022). Aandhee Ka Rajz. Shehar Zad.
2. Hasan, F. (2015). Sattia Pal Anand Ki Sath Muntakhib Nazmain. Sheher Zad.
3. Orwell, G. (2006). Animal Farm. Paguine Random House. (p. 86)
4. Huntington, S. P. (1993). Clash of Civilizations and the Making of World Order. Simon & Schuster. (p. 47)
5. Aarif, I. (2017). Ktabay Dil o Dunia. Maktaba Danyal.
6. Mayer, W. D. (2018). Colonialism and Islam: Western Perspectives on Soviet Asia. Proquest LLC. (p. 221)
7. Shah, S. M. (2017). Kulyat E Mubarak Shah. Book Corner.
8. Akhter, M. (1978). Makalat e Taseer. Majlasay Taraqee E Adab.
9. Rashid, N. M. (1988). Kulyat e Rashid. Mawara Publishers.
10. Meer, S. (1978). Aakhray Shab Kay Hamsafar. Klaseek.
11. Shan, Z. (2011). Saree Nazmain. Aaj Ki Kitabain.

12. Firaqee, T. (2019). Shakh e Zaryab. Universal Books.
13. Ahmad, W. (2020). Paryan Utertee Hain. Romail House of Publications.
14. Iqbal, K. (2014). Adab Aor Zamana. Adara Saqafatay Islamia.
15. Hasan, Z. ul, & Nayyar, N. A. (Eds.). (2008). 1857 KI Jang E Azadi aor Urdu Zuban o Adab. Oriental College.